مولانا مفتی محمد زاہد
نائب صدر جامعہ اسلامیہ امدادیہ، فیصل آباد۔

آئین اور قانون کی بالادستی کی جدوجہد
اور دینی حلقوں کی ذمہ داری

[۱۲ رنومبر ۲۰۰۷ کو جامعہ اسلامیہ امدادیہ فیصل آباد کے فضلا کے ایک اجتماع سے خطاب]

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت ہمارا ملک بلکہ پورا عالم اسلام اور پوری دنیا بڑے عجیب وغریب حالات سے گزر رہی ہے۔ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور تبدیلیاں بھی فیصلہ کن، خاص طور پر عالم اسلام میں اور عالم اسلام کے چند اہم ملکوں میں جن میں شاید سرفہرست ہمارا وطن عزیز پاکستان ہے۔ ہم امت مسلمہ کا ایک حصہ ہونے کے ساتھ پاکستان کے شہری بھی ہیں اور یہ ملک ہمارا گھر ہے۔ جو حضرات دین کے کام سے وابستہ ہیں، وہ ہماری برداری ہے اور اللہ کے فضل وکرم سے ہم ان کا بھی ایک حصہ ہیں، اس لیے ہم کبھی بھی اپنے آپ کو امت، پاکستان اور دینی حلقوں کے مسائل سے الگ نہیں رکھ سکتے اور بے فکر بھی نہیں رہ سکتے۔ جو کام کسی بھی میدان میں ہو رہا ہے، چاہے وہ ملکی سطح پر ہو، عالم اسلام کی سطح پر ہو یا دینی حلقوں کی سطح پر، ہم اپنے آپ کو اس سے لاتعلق نہیں رکھ سکتے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ: من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کے معاملات میں فکر مند نہیں ہوتا، بے فکری اور بے حسی کا شکار رہتا ہے جسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''سانوں کی'' (ہمیں کیا) وہ مسلمانوں میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں۔ ہماری بحیثیت مسلمان اور بحیثیت انسان یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہماری نظر میں ہو کہ کیا ہو رہا ہے اور ان حالات میں ہمارے کرنے کا کیا کام ہے، خاص طور پر اس حیثیت سے کہ اللہ جل جلالہ نے ہمیں اپنے دین کے کسی نہ کسی کام سے وابستہ کیا ہوا ہے، اور کسی نہ کسی حد تک ہماری بات سنی اور مانی جاتی اور اس کا اثر ہوتا ہے، کسی کا زیادہ اور کسی کا کم۔ اس لیے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہمیں حالات کا علم ہو اور حالات پر ہماری مکمل نظر ہو کہ کیا ہو رہا ہے اور ہمارے کرنے کا کیا کام ہے۔ کام کرنے کے کئی میدان ہوتے ہیں، کئی پہلو اور کئی رخ ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کے سب ایک ہی انداز کے کام میں لگے ہوں، لیکن بہرحال ملت اور امت اور خاص طور پر اپنے ملک کے حالات کے بارے میں فکرمندی اور دائرے کے اندر رہتے ہوئے، اپنے کام کی نوعیت برقرار رکھتے ہوئے، حالات کی بہتری کے لیے جو کچھ ہو

سکتا ہے، وہ کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

اس وقت ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، پوری امت کے لیے بالعموم اور دین کا کام کرنے والوں کے لیے بالخصوص فیصلہ کن لگ رہے ہیں۔ حالات یا آگے جائیں گے یا اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، ریورس گیئر لگ سکتا ہے۔ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے، یہ ایک ایسی بحث ہے کہ اس میں ایک سے زیادہ آرا ہو سکتی ہیں اور یہ آرا کا تنوع ہمیشہ مفید ثابت ہوتا ہے، بشرطیکہ ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ ہو۔ بعض اوقات متضاد پالیسیاں ہوتی ہیں اور متضاد آرا ہوتی ہیں، ہر کوئی اپنے اپنے طریقے پر چل رہا ہوتا ہے، لیکن بحیثیت مجموعی اللہ تعالیٰ اس میں خیر پیدا فرما دیتے ہیں۔ آپ اپنی گھڑی کو کھول کر دیکھیں، اس میں کئی کچھ گراریاں دائیں سے بائیں اور کچھ بائیں سے دائیں چل رہی ہوں گی، لیکن بحیثیت مجموعی ساری گراریاں مل کر جو نتیجہ دے رہی ہوتی ہیں، وہ ایک ہوتا ہے اور وہ ہے وقت بتانا۔ تو یہ آرا کا تنوع، طریقہ کار کا تنوع ہمیشہ فائدہ مند رہا ہے اور اسی کو کہا گیا ہے کہ اس امت کا اور علما کا اختلاف رحمت ہے۔ مغربی دنیا خاص طور پر اس پر بڑا فخر کرتی ہے کہ ہمارے معاشرے کے اندر تنوع آرا کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں diversity ہے، pluralism ہے، لیکن وہ یہاں تک صدیوں کے دھکے کھانے کے بعد پہنچے ہیں اور ہمیں یہ بات ابتدا ہی سے سمجھا دی گئی تھی کہ سب کے سب ایک ہی کھینچی ہوئی لکیر پر چل رہے ہوں، یہ کوئی ضروری نہیں، بلکہ بہت سی جگہوں پر تنوع اور تعدد آرا کی گنجایش رکھی گئی ہے کہ پالیسیوں اور طرز عمل میں آرا کا اختلاف اور تنوع اگر ایک دوسرے کے احترام کے ساتھ ہو تو بظاہر بالکل مختلف رخ بھی نظر آ رہے ہوں، تب بھی بحیثیت مجموعی امت کو، معاشرے کو، دین کو اور دین کے کام کو فائدہ ہی پہنچتا ہے۔

میں صرف ایک چھوٹی سی بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اس وقت یوں لگ رہا ہے کہ جیسے ہمارا ملک خاص طور پر ایک خاص حوالے سے فیصلہ کن موڑ پر کھڑا ہے۔ دو راستوں میں سے ایک اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ ملک یا صحیح راستے پر چڑھے گا یا غلط راستے پر، لیکن جس راستے پر ایک دفعہ چڑھ گیا، اس سے ہٹانا انتہائی مشکل ہوگا۔ یہ وقت فیصلہ کن ہے اور جس طرف کو گاڑی چل پڑی، بظاہر اسی طرف چلتی رہے گی۔ اس میں ہمارا وزن کس جانب ہونا چاہیے؟ دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ اس ملک کے اندر عوام کی آواز کو تسلیم کیا جائے۔ ہمارا دستور و آئین یہ کہتا ہے کہ اس ملک کے اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بعد اس ملک کی قسمت کے مالک باہر سے یا اندر سے مسلط کیے ہوئے چند افراد نہیں بلکہ اس ملک کے عوام ہیں۔ یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ یہاں کے شہری سب کے سب انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے ان کے کچھ حقوق ہیں جنہیں شہری حقوق کہا جاتا ہے۔ شہری حقوق اور شخصی آزادیوں کی ضمانت عملاً نظر آئے۔ ''وسیع تر قومی مفاد'' نامی کسی چڑیا کے کہنے پر یا کسی بھی بہانے سے ان پر جبر کرنے اور قدغنیں لگانے کا اختیار کسی کو نہ ہو۔ آپ یہ کہہ سکتے ہو یا نہیں، آپ یہ لکھ سکتے ہو یا نہیں۔ بہت واضح اور معقول وجہ کے بغیر کسی کو بات کہنے سے روکا نہ جا سکے۔ تم نے یہ کیوں لکھا ہے؟ تم نے یہ کیوں کہا ہے؟ فلاں جگہ پر تم جمع کیوں ہوئے تھے؟ فلاں پارٹی کے ساتھ تمہاری وابستگی کیوں ہے؟ اس طرح کی پابندیاں لگانے کے بجائے ان معاملات میں آزادی ہو۔

یہ باتیں ہمیں تھوڑی سی اجنبی لگتی ہیں۔ اجنبی اس لیے لگتی ہیں کہ پچھلی چند صدیوں سے ان باتوں کی مغرب نے رٹ لگائی ہے اور اپنے ہاں انہوں نے اپنے عوام کو ایک بڑی حد تک یہ حقوق اور آزادیاں دے رکھی ہیں۔ جس طرح کی ایمر جنسیاں

اور قوانین یہاں چلتے ہیں اور جس طرح کی پابندیاں یہاں لگتی ہیں، کسی مغربی ملک برطانیہ، امریکا اور یورپ کے کسی ملک میں یہ آسان کام نہیں۔ اگر وہاں اس طرح کی کوئی چھوٹی سی بھی بات ہو، ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ چند سال پہلے بعض چھوٹی چھوٹی باتوں پر لاکھوں لوگوں کے مظاہرے ہوئے، لاکھوں لوگ باہر نکلے۔ انہوں نے اپنے ہاں ان چیزوں کو منوالیا ہے۔ تو چونکہ انہوں نے اپنے ہاں منوایا ہے، اپنے ہاں روبعمل لائے ہیں، اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ چیزیں ان کی ہیں، یہ باتیں اسلام سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رکھتیں۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ آپ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد سنا ہوگا کہ ''تم نے لوگوں کو کب سے غلام سمجھنا شروع کر دیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا''۔ جو انسان پیدا ہوتا ہے، وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزادی ساتھ لے کر آتا ہے۔ فطری طور پر وہ آزاد ہوتا ہے۔ آپ کسی کو کسی معاملے میں جکڑنا چاہتے ہیں تو جکڑنے کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ کسی کو آزاد رہنے کی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً میں کوئی کام کر رہا ہوں، آپ مجھے روکنا چاہتے ہیں تو آپ وجہ بتائیں کہ آپ کیوں روکنا چاہتے ہیں۔ میں اس چیز کا پابند نہیں ہوں کہ آپ چونکہ اس ملک کے حاکم ہیں، آپ ڈی سی ہیں، آپ تھانیدار ہیں، اس لیے پہلے میں آپ کو قائل کروں گا کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ نہیں، میری مرضی۔ میں آزاد ہوں، یہ میرا حق ہے۔ آپ اگر روکنا چاہتے ہیں تو آپ کی ذمہ داری ہے کہ مجھے بتائیں اور سمجھائیں کہ آپ مجھے کیوں روکنا چاہتے ہیں؟ پیدائشی آزادی کا یہی مطلب ہے کہ کسی کو کسی چیز سے روکنے کے لیے وجہ درکار ہے، کرنے کے لیے نہیں۔

مغرب نے اپنے ہاں شہری آزادیوں کو نافذ کیا ہے اور یہ بات یاد رکھیں کہ مغرب نے صدیوں کی جدوجہد سے جو یہ مقام حاصل کیا ہے اور یہاں تک پہنچا ہے، یہ ہمارے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف گوروں کے لیے ہے اور ہمیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہے کہ یہ ان کی صدیوں کی جدوجہد ہے جو انہوں نے اپنے لیے کی ہے۔ ہم جدوجہد کریں گے تو اپنے لیے کریں گے۔ انہوں نے ایک چیز حاصل کی ہے تو وہ اپنے لیے حاصل کی ہے۔ ہم یہ چاہیں کہ مغرب چونکہ ان شہری آزادیوں کو تسلیم کرتا ہے، وہاں امریکا اور برطانیہ میں پائی جاتی ہیں تو اسی معیار کی یہ آزادیاں امریکا، برطانیہ وغیرہ اسلامی ملکوں میں ہمیں دلوادیں گے، اس کی توقع رکھنا فضول ہے۔ اپنے گھر خود بنانے پڑتے ہیں۔ اگر آپ کے ہمسایے نے اچھا گھر بنالیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آپ کا گھر بھی خوب صورت بنادے گا۔ یہ چیز ہمیں خود اپنی محنت سے حاصل کرنا ہوگی۔ اس کے لیے آزاد اور مضبوط ریاستی ادارے ناگزیر ہوتے ہیں، چاہے وہ پارلیمنٹ اور مقننہ ہو، انتظامیہ ہو یا عدلیہ ہو، خاص طور پر عدلیہ آزاد ہو۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ الیکشن کے دنوں میں انڈیا کے اندر الیکشن کمیشن کی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وزیراعظم تک اس سے تھر تھر کانپ رہا ہوتا ہے۔ اندرا گاندھی نے اپنے ایک الیکشن میں اپنی سرکاری حیثیت کا استعمال کرلیا تھا تو وہاں کی عدالتوں نے الیکشن کالعدم قرار دے دیا تھا۔ عدالتوں کی آزادی ناگزیر ہوتی ہے۔ امریکی انتظامیہ نے کیوبا، گوانتانا موبے کے قیدیوں کے بارے میں یہ چاہا کہ ان پر صرف فوجی قانون لاگو ہو، امریکا کا عام قانون ان پر لاگو نہ ہو۔ اس پر بہت زور لگایا لیکن امریکہ کی سپریم کورٹ نے اسے نہیں چلنے دیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ عام لوگوں کو جتنا اعتماد برطانیہ، امریکا کی عدالتوں پر ہے، اتنا اعتماد پاکستان بلکہ کسی بھی اسلامی ملک کی عدالتوں پر نہیں ہے، کیونکہ آزاد اداروں کا تصور، شہری حقوق اور شخصی آزادیوں کا تسلیم کیا جانا، اس طرح کی باتیں ہمارے معاشرے میں فکری عیاشی سمجھی جاتی ہیں۔ عام آدمی یہ سمجھتا ہے

کہ یہ ایک فکری عیاشی ہے، اس کا ہماری روٹی سے کوئی تعلق ہے نہ پہناوے سے اور نہ ہماری بنیادی ضرورتوں سے، لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ یہ چیزیں کسی بھی معاشرے کے لیے بنیادی حیثیت کی حامل ہوتی ہیں۔ جب تک یہ چیزیں حاصل نہ ہوں، اس وقت تک قومیں ترقی نہیں کرتیں۔ بے شک سڑکیں اچھی بن جائیں، جال بچھ جائیں، سڑکوں پر پل بن جائیں، یہ صرف ظاہری ترقی ہے۔ اصل ترقی انسانی، سیاسی اور سماجی ترقی ہے جس میں مضبوط اداروں کے زیر سایہ شہری حقوق اور شخصی آزادیاں تسلیم شدہ ہوں۔

اس وقت ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایک انتہا ہے۔ مختلف اداروں پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد ہو رہی ہیں، ٹی وی چینلوں اور اخبارات وجرائد پر پابندیاں اور جکڑ نیں ہیں اور یہ سب کچھ روشن خیالی کا نام جپنے والوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہماری معلومات کے مطابق الحمد للہ ابھی تک بعض اخبارات اور ٹی وی والوں نے حکومت کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے، حکومت جس طرح کا قانون نافذ کرنا چاہتی ہے، اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے، بند پڑے ہوئے ہیں۔ اور بھی کئی طبقے اللہ کے فضل سے اس بات پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ حکومتی جبر نہیں مانیں گے۔ اب دو راستے ہیں۔ یا تو ملک کو دستور پسند اور مہذب معاشرہ دیکھنے کے خواہشمند بھرپور طریقے سے اپنی بات تسلیم کروائیں گے اور موجودہ حالات کا ایسا نتیجہ نکلے گا کہ آئندہ آنے والوں کو یقین ہو جائے کہ یہاں کے لوگ اب اتنے باشعور ہو چکے ہیں کہ یہاں کسی کی مطلق العنانی نہیں چل سکتی، لوگوں کے حقوق چھینے نہیں جا سکتے، لوگوں پر بے جا ریاستی دباؤ اور جبر نہیں چل سکتا، فرد واحد کی خواہش پر اداروں کو تہس نہس نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ملک ایک خاص راستے پر چڑھے گا۔ ایک دفعہ یہ بات سمجھ میں آ گئی تو پھر ان شاء اللہ یہ ملک صحیح رخ پر چلتا رہے گا۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی تسلیم کر لے کہ ''سانوں کی'' (ہمیں کیا) موجودہ صورت حال سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، یہ اخبارات والوں کا مسئلہ ہے، یہ ٹی وی چینل والوں کا مسئلہ ہے، یہ ججوں کا مسئلہ ہے، یہ وکیلوں کا مسئلہ ہے، یہ دینی حلقوں اور مولویوں کا مسئلہ ہے۔ ہر کوئی اپنے حصے کی مار الگ الگ کھاتا رہے۔ اس سے ملک ایک خاص راستے پر چڑھے گا۔ آنے والی حکومتوں کو پتہ ہوگا کہ جیسے پہلے ساٹھ سال سے ہوتا آ رہا ہے، جب دیکھا کہ عدلیہ ہماری تابعداری سے نکل رہی ہے تو کسی نہ کسی طریقے سے اپنے مرضی پر لے آئیں۔ جب دیکھا کہ لوگوں تک بات پہنچانے کے جتنے ذرائع ہیں، جتنا میڈیا ہے، وہ ایک خاص حد سے نکل رہا ہے، ہماری منشا کے مطابق نہیں چل رہا تو ان کو پکڑ کر جکڑ دیں اور کہیں کہ لوگوں نے مان لیا اور ''سانوں کی'' کا رویہ اختیار کر کے ہماری خاموشی نے تصدیق کر دی۔ لہٰذا یہ صرف چند لوگوں کا مسئلہ ہے۔ اس سے ملک ایک دوسری قسم کی ڈگر پر چلے گا اور یاد رکھیں کہ گاڑی کا رخ جس طرف کو بھی مڑا، اس کے اچھے یا برے اثرات ہم یعنی دین کا کام کرنے والوں پر بھی لازماً پڑیں گے۔ اگر ملک کی یہ گاڑی شخصی آزادیوں کے راستے پر چل نکلی، شہری حقوق، دستور پسندی اور آئین کی پاس داری کے راستے پر چل نکلی تو اس کے اثرات وثمرات سے دینی حلقے بھی مستفید ہو سکیں گے۔ اس کا فائدہ جہاں لادین طاقتوں کو ہوگا، وہیں ہمیں بھی ان آزادیوں اور شہری حقوق سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔

اگر خدانخواستہ گاڑی کا رخ دوسری طرف ہو گیا اور آپ نے کسی کا یہ اختیار تسلیم کر لیا کہ وہ اپنی مرضی سے جس کا چاہے، گلا دبا دے تو جس نے آج ان کا دبایا ہے، کل آپ کا بھی دبا سکتا ہے۔ آج اگر اس کا گلہ دبانے کی طاقت حاصل

کرتا ہے تو کل آپ کا بھی دبا دے گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارا اس سے زیادہ دبائے۔ آج کئی لوگوں کے لیے بات کہنا اور لکھنا مشکل ہے اور دوسرے شہری حقوق بھی پامال ہو رہے ہیں تو کل کو ہمارے لیے دین کے کام میں بھی مشکلات آسکتی ہیں۔ آپ دوسرے اسلامی ملکوں کا حال دیکھ لیں۔ سعودی عرب اور ترکی کا حال دیکھ لیں، وہاں کی حکومتوں کے نقطہ نظر سے ہٹ کر آپ دین کی کوئی بات بھی کر سکتے ہیں؟ تبلیغی جماعت کا کام آزادی سے کر سکتے ہیں؟ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ تبلیغ والے حضرات کہنے لگے کہ آج کل ہمیں ترکوں پر زیادہ محنت کرنے کا کہا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ جماعتیں ترکی میں جا رہی ہوں گی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، اس مقصد کے لیے جماعتیں زیادہ تر جرمنی میں جا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ محنت ترکوں پر اور جماعتیں جرمنی میں جا رہی ہیں؟ کہنے لگے اس لیے کہ ترکی میں وہ حقوق نہیں، وہ آزادیاں نہیں ہیں جو جرمنی میں ہیں۔ ترک چونکہ جرمنی میں کثرت سے ہیں ملازمت اور کسب معاش وغیرہ کے سلسلے میں، اس لیے جرمنی میں جا کر ترکوں پر محنت کرتے ہیں اور ترکی میں یہ کام نہیں ہوسکتا۔

کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ شاید ہماری نفسیات میں کہیں سے یہ بات آ گئی ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی آ کر لوگوں کو جکڑے، ان کے ہاتھ پاؤں باندھے اور ہم ان جکڑے ہوئے لوگوں میں دین کا جام انڈیلیں، لیکن یاد رکھیں یہ ہم میں سے کسی کی خواہش تو ہوسکتی ہے، خود اسلام فطری طور پر اتنا بودا اور بے کشش نہیں ہے کہ اسے اس طرح کی کسی بیساکھی کی ضرورت ہو۔ آپ پچھلے کچھ عرصہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ جن جن ملکوں میں شہری حقوق اور شخصی آزادیاں جتنی زیادہ تسلیم کی گئی ہیں، جتنا زیادہ کھلا ماحول ملا ہے، وہاں اسلام اتنا زیادہ پھیلا ہے اور جو ملک اشتراکی نظام کے زیر اثر رہے ہیں، اشتراکیت میں چونکہ ان حقوق کو سلب اور چھینا جاتا ہے، جیسے روس ہے، چائنا ہے، وہاں اسلام اتنا نہیں پھیلا جتنا امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ میں پھیلا ہے۔ آج مسلمان ملکوں کے اندر عورتیں حجاب چھوڑ رہی ہیں، لیکن مغرب میں مسلمان ہو کر حجاب اوڑھ رہی ہیں۔ کھلے ماحول میں جب بھی اسلام کی بات چلے گی تو وہ لوگوں کے دل ودماغ میں خود جگہ بنائے گی۔

بات یہ کر رہا تھا کہ اس وقت ہماری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہونی چاہییں؟ میں کسی خاص طبقے کی بات نہیں کر رہا۔ ہم اگر عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم ذہنی اور فکری طور پر ہماری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہونی چاہییں؟ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ اس وقت چند ججوں اور وکیلوں کا نہیں، نہ اخبارات والوں اور ٹی وی والوں کا ہے، بلکہ مسئلہ اصول اور رخ کا ہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہمیں کون سا راستہ سوٹ کرے گا۔ اس وقت ہم اپنا وزن صحیح جانب ڈالیں کیونکہ یہ فیصلہ کن موڑ ہے۔ اپنے آپ کو بالکل لاتعلق نہ رکھیں، اب یہ کہنے کا موقع نہیں رہا کہ ''سانوں کی''۔ اگر آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کر لیا گیا تو اس سے ہم بھی مستفید ہوں گے۔ قانونی ڈھانچے اور قانونی دائرے کے اندر رہتے ہوئے آپ کوئی مدرسہ بنائیں یا کوئی مسجد بنائیں تو آپ کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ برطانیہ اور امریکا میں اور یورپ کے دیگر ملکوں میں وہاں کے قانون کے مطابق اگر مسجد بنانا چاہتے ہیں تو وہاں کی حکومت کی مجال نہیں کہ وہ آپ کو روک دے، محض اس وجہ سے کہ ہمیں پسند نہیں۔ آپ مندر بنانا چاہیں تو آپ کا حق ہے، آپ بنائیں۔ آپ گرجا گھر بنانا چاہیں، آپ کا حق ہے، بنائیں۔ تو حقوق کو تسلیم کیے جانے کا جو راستہ ہے، شہری حقوق اور شہری آزادیوں کا جو راستہ ہے، اس سے جتنا زیادہ فائدہ دوسروں کو ہوگا، اس سے کہیں زیادہ فائدہ ہم اٹھا سکیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو ایک خاص قانونی دائرے کے اندر رکھنا پڑے گا، لیکن اس حد کے اندر رہتے ہوئے تو کم

ازکم روک ٹوک نہیں ہوگی۔ ہم اپنا کام آزادی سے کرسکیں گے، دین کی بات بڑھاسکیں گے، پھیلاسکیں گے، لوگوں تک پہنچا سکیں گے، اور یہ ہماری طاقت نہیں بلکہ دین کی اپنی طاقت ہے۔ دین اپنے آپ کو خود منواتا ہے۔ تو جہاں تک ہماری بات چلتی ہے، جہاں تک ہمارے قلم کی دسترس ہے، ورنہ کم ازکم ہمدریوں کی حد تک ہمیں صحیح جانب وزن ڈالنا چاہیے، خاص طور پر ہم میں سے جو لوگ سیاسی میدانوں میں ہیں۔ ہمیں اپنی سیاسی قیادت پر نظر رکھنی چاہیے۔ اگر امیر المومنین کو برسرِ عام غلطی پر ٹوکا جاسکتا ہے تو دینی سیاسی قیادت اگر غلط راستے پر چل رہی ہے تو اس کو بھی بتایا جاسکتا ہے کہ جناب! آپ یہ ٹھیک نہیں کر رہے۔ خاص طور پر جو لوگ سیاسی میدان میں ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ قیادت کو بتائیں کہ ہمیں پتہ ہے کہ اندر سے کیا ہو رہا ہے اور باہر کیا کیا جارہا ہے۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ ہمیں پتہ نہیں ہے۔ سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لیڈروں کو بتائیں کہ ہم محض آپ کی زبان کی چکناہٹ اور خوب صورت دلیلوں سے متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ کے بیانات اور طرزِ عمل اور پالیسیوں میں یکسانیت نمایاں نظر آئے۔

اس ملک کے ساتھ اس وقت چند قائدین اتنا سنگین مذاق کر رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ ہماری چالبازیوں اور مذاق سے لوگ بے وقوف بن جائیں گے۔ اس کا نقصان جس طرح ملک کو پہنچے گا، ویسے ان کو بھی پہنچے گا۔ اس وقت کی صورت حال سے دل اتنا دکھا ہوا ہے کہ کوئی قیادت نظر نہیں آرہی ہے۔ نچلی سطح پر پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ لوگوں میں شعور بیدار ہو رہا ہے، لیکن اوپر کی سطح پر کوئی قیادت ہی نہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ملک کا جو بہت متمول طبقہ ہے تو اسے اپنے مفادات کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور نچلا طبقہ مہنگائی کی چکی میں ایسا پسا ہوا ہے کہ اسے اپنی دال روٹی سے فرصت نہیں۔ لے دے کے مڈل کلاس خصوصاً اپر مڈل کلاس رہ جاتی ہے۔ اس وقت بیداری کی لہر بھی سب سے زیادہ اس میں ہے اور علما کے ساتھ رابطہ اور تفاعل اس کا سب سے زیادہ ہے۔ اس لیے بھی اس طبقے پر خاصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک وقت تھا کہ مطلق العنانی کے خلاف مزاحمت کی علامت مولوی ہوتا تھا۔ لوگوں کی نظریں مولانا غلام غوث ہزاروی رحمہ اللہ پر ہوتی تھیں، مفتی محمودؒ پر ہوتی تھیں، لیکن آج لوگ سوچنے پر مجبور ہیں۔ آج لوگوں کی نظریں اعتزاز احسن پر ہیں، جاوید ہاشمی پر ہیں، منیر اے ملک، افتخار چوہدری پر ہیں۔ آپ لوگوں سے خود جا کر پوچھ لیں، خود سروے کرلیں۔ اور نہیں تو کم ازکم اپنے مقتدیوں کا ہی سروے کرلیں، ہم لوگ کسی زمانے میں ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت کی علامت ہوتے تھے۔ اب اس جگہ پر پہنچ گئے، یہ ہمارے لیے سوچنے کی بات ہے۔ ہم عام تقریریں نہیں کرسکتے، عوام کو بھڑ کا نہیں سکتے تو کم ازکم اپنے دائرے کے اندر رہتے ہوئے سوچ تو سکتے ہیں اور اپنی دینی لیڈرشپ کو جتا سکتے ہیں۔ اگر ان کو یہ پتہ چل جائے کہ نیچے والوں نے صرف ہمارے حق میں نعرے نہیں لگانے بلکہ ہماری پالیسیوں کو چیک بھی کرنا ہے تو انہیں بھی اپنی پالیسیوں پر غور اور نظرِ ثانی کے لیے وقت نکالنا پڑے گا۔ اس معاملے میں اگر ہم نے سستی کی تو خدانخواستہ ہم پر کہیں وہ وقت نہ آجائے کہ ہم چیخیں لیکن کوئی سننے والا نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے، آمین۔

(ضبط و تلخیص: مولانا مفتی محمد اصغر۔ بشکریہ مجلّہ ''الحقانیہ'' ساہیوال، سرگودھا، جنوری ۲۰۰۸)